ڈاکٹر پروین شوکت علی

اقبالؒ اور تصورِ قومیّت

عصرِ جدید کے افکار و نظریات میں تصورِ قومیت ایک ایسا اہم نظریہ ہے جو اقبال کے لیے بہت غور و فکر اور توجہ کا باعث بنا اور انھوں نے اپنی شاعری، تقاریر، بیانات اور مکتوبات میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ فکرِ اقبال کے طالب علم کے لیے یہ مسئلہ عمیق دلچسپی کا موجب ہے۔ اس لیے کہ تصوّرِ قومیت فکرِ اقبال کے وسیع بوستان کا ایک دلکش گوشہ ہے اور ان کا کلام اور تحریریں اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہیں کہ اقبال نے اہلِ مغرب کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کی تنگنائے کو ترک کر کے اسلامی قومیت کی عالمگیر وسعت کو قبول کر لیا۔ فکرِ اقبال میں اس نمایاں تبدیلی کا سبب معلوم کرنا اقبالیات کے طالب علم کے لیے یقیناً بہت دلچسپ ہے۔

اپنی شاعری کے پہلے دَور میں اقبال مغربی تصورِ قومیت سے متاثر تھے اور بانگِ درا کی ابتدائی نظمیں ان کو ایک ہندوستانی قومیت پرست شاعر کی شکل میں پیش کرتی ہیں۔ لیکن قیامِ یورپ کے زمانے میں انھوں نے جب اس نظریہ کا غائر مطالعہ کیا اور عالمِ اسلامی میں یورپی سامراج کی مداخلتِ ناروا اور مشرقِ وسطیٰ میں قومی تحریکوں کے آغاز و فروغ کے تباہ کن نتائج دیکھے تو ان کے نقطۂ نظر میں انقلابی تبدیلی ہو گئی اور اس کے بعد انھوں نے جو نظمیں لکھیں وہ اسلامی اخوت اور ملّتِ اسلامیہ کی وحدت کے جذبہ کی آئینہ دار ہیں۔ اسلوبِ نظر کے اسی تغیر کی بنا پر اقبال کو فلسفۂ اسلام کا صاحبِ بصیرت شارح اور حکیم تسلیم کیا گیا ہے اور اسی تبدیلی کی وجہ سے ان کی ہستی قومیتِ نسل و وطن کے علم برداروں اور قومیتِ اسلام کے حامی حق شعاروں کے درمیان مابہ النزاع بن گئی۔

مسئلہ قومیت کے بارے میں اقبال کے افکار ہمارے لیے اس وقت اور بھی محلِ اعتنا بن جاتے ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں جن اربابِ علم سے ان کا اختلاف رہا

ان میں ابوالکلام آزاد اور حسین احمد دیوبندی جیسے ممتاز علما بھی شامل ہیں۔ علامہ اقبال اور بعض ممتاز علمائے دین کے نقطۂ نظر میں اس اختلاف کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ان علما نے جدید مغربی افکار کا غائر مطالعہ نہیں کیا تھا اور ان کی تہ میں جو مقاصد کام کر رہے تھے وہ ان سے واقف تھے۔ لیکن اقبال نہ صرف دینی بصیرت اور فہم و فراست میں ممتاز ترین علما کے ہم پایہ تھے بلکہ مغربی افکار و نظریات پر بھی کامل عبور رکھتے تھے۔ اس لیے مسئلہ قومیت کے بارے میں اقبال کی روشنی فکر قوم پرست علما کے نقطۂ نظر سے متضاد تھی۔ اسلام کے اساسی اصول اور مسئلہ قومیت کا نگاہِ غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ اس عقدۂ نظری کو حل کرنے میں اقبال کی نگاہ زیادہ دور رس اور نکتہ شناس تھی اور ان کا حاصلِ تحقیق و ادراک ان کے حریفوں کے نقطۂ نظر کی بہ نسبت قرآن و سنت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اقبال قرآنی نظریۂ حیات کے پرجوش داعی تھے۔ انھوں نے مسئلہ قومیت کو بھی اسی روشنی میں دیکھا اور اسے اپنی شاعری کا ایک اہم ترین موضوع بنایا۔

نظریاتی اعتبار سے اقبال کی شاعری نے جو منزلیں طے کیں اور ان کے افکار میں جو تبدیلی ہوئی وہ سب اُن کے اوّلین مجموعۂ کلام "بانگ درا" میں بہت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومی شاعری کا دور بہت جلد ختم ہو گیا اور ملّی نظریات ان کی شاعری کی اساس بنے۔ یہ رجحان برابر ترقی کرتا گیا اور ان کے دوسرے مجموعے اسی تنویرِ فکر سے روشن نظر آتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے سفرِ یورپ اختیار کرنے سے قبل اقبال ایک پرجوش قوم پرست تھے اور ہمالہ، نیا شوالہ اور ترانۂ ہندی جیسی نظمیں ان کے اسی جوشِ قومیت کی آئینہ دار ہیں۔ بانگِ درا کی نظم "ہمالہ" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کو سرزمینِ ہند سے کتنی محبت تھی اور اس کے قدرتی حسن و مناظرِ فطرت سے وہ کس قدر متاثر تھے۔ "نیا شوالہ" میں اقبال نے وطنیت کی اساس پر اتحاد اور ہم نوائی و ہم نگاہی کے جذبہ کو ابھارا ہے اور مشہور و معروف ترانۂ ہندی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

ایک ایسی دل آویز نظم ہے کہ بعض اربابِ قلم کی رائے میں آزاد و خود مختار ہندوستان کا صحیح معنوں میں یہی قومی ترانہ ہے

ایک اور نظم "تصویرِ درد" میں اقبال نے اہلِ وطن کی زبوں حالی پر جس شدت سے اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو وطن سے کس قدر محبت تھی۔ وہ کہتے ہیں :

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مگر فکرِ اقبال کا یہ رخ عارضی تھا۔ اور وہ بہت جلد شاعرِ ہند کے مقام سے کنارہ کش ہو کر سخنورِ اسلام ہو گئے۔ ۱۹۰۸ میں وہ یورپ سے واپس آئے اور وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اور سمجھا تھا اس کی بنا پر قومیت کے بارے میں ان کا زاویۂ خیال تبدیل ہو چکا تھا۔ اس روشنیِ فکر اور نظریاتی تبدیلی کے کئی اسباب تھے جس کے اثرات اور شواہد ان کی نظم و نثر میں موجود ہیں۔

موجودہ صدی کے ابتدائی دس سال عالمی سیاست میں بین الاقوامی افراتفری و اضطراب کا زمانہ تھے۔ یورپ کی تمام قومیں حُبِ جاہ و ہوسِ اقتدار میں مبتلا تھیں۔ جذبۂ قومیت نے باہمی منافرت کی شکل اختیار کر لی تھی اور وہ ایک دوسرے کی حریف بنی ہوئی تھیں۔ اقبال نے قیامِ یورپ کے دوران میں استعمار پسند اربابِ اقتدار کی انتہائی ہلاکت آفریں حکمتِ عملی کا مشاہدہ کیا تھا جو اپنی قومی برتری قائم کرنے کے لیے عالمِ انسانیت کو تاریخ انسانی کی ایک مہلک ترین تباہ کاری کے لیے تیار کر رہے تھے اور قومی شوکت و شمت کے حصول کے لیے سامراجی مسابقت و منافرت نے امنِ عالم کو ہلاکت کے تیرہ و تار غار تک پہنچا دیا تھا۔ اقبال کی فطرت نہایت امن پسند اور صلح جو تھی اور وہ انسانی زندگی کی قدر و منزلت اور احترامِ انسانیت کے قائل تھے۔ اس لیے ان کے ضمیر نے اس عناد آمیز و منافرت انگیز تصورِ قومیت سے بغاوت کی جس کے نتائج خوں ریزی اور اتلافِ حیات کے

سوا کچھ نہ ہو سکتے تھے۔ بانگِ درا میں انھوں نے اس تصورِ قومیت کے نقائص بیان کیے ہیں۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقبال نے جدید مغربی تصورِ قومیت کو ترک کر کے عالمگیر ملّتِ اسلامیہ کا تصوّر قبول کر لیا اور اس کے پُرجوش مبلغ بن گئے۔ اس تبدیلی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اپنی غیر معمولی فہم و فراست سے انھوں نے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اقوامِ یورپ مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے مسلم ممالک کے خلاف سرگرمِ عمل ہیں اور ان پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ کو ان ممالک کے سربراہ کا رتبہ حاصل تھا مگر اس کا سفینہ تنزل و انحطاط کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔ یہ شہنشاہیت مختلف ملکوں اور علاقائی وحدتوں پر مشتمل تھی اور ان کو اسلامی رشتے نے ایک وحدت بنا رکھا تھا۔ مغربی اقوام نے اپنے سامراجی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اس رشتے کو ختم کرنا ضروری قرار دیا اور مغربی تصوّرِ قومیت کی تبلیغ و اشاعت اس انداز میں ہونے لگی کہ مسلمان بھی اس نظریہ کو صحیح تسلیم کرنے لگے۔ اسلامی دنیا میں شمعِ اسلام کی روشنی مدھم ہو گئی تھی اور یورپ کی سامراجی قومیں کوشاں تھیں کہ مسلمان اس خلا کو مغربی افکار و نظریات کی اندھی تقلید سے پُر کریں۔ مغربی سامراج کے ان ہتھکنڈوں سے اقبال بخوبی واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ اسلامی ممالک میں مغربی تصوّرِ قومیت کے فروغ سے اسلامی دنیا اور مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہونچ رہا ہے، اس لیے انھوں نے مغربی تصور کو مسترد کر دیا اور ملتِ اسلامیہ کے عالمگیر تصوّر کی اشاعت اور اتحاد و اخوتِ اسلامی کے فروغ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

۱۹۰۸ میں اقبال اس مرحلۂ فکر میں منزلِ یقین تک پہونچ گئے تھے کہ مغربی تصورِ قومیت انسانی مدنیت کے لیے سمِ قاتل ہے اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے جن کے دینی اصول و نظریات اس تصور کے بالکل خلاف ہیں۔ جدید تصوّرِ قومیت سے اقبال کا تنفر محض اس بنا پر نہ تھا کہ وہ ملتِ اسلامیہ کی عالمگیریت کے معتقد تھے بلکہ ان کو یہ بھی یقین تھا کہ یہ تصورِ قومیت وحدتِ انسانی اور بین الاقوامی امن کے بھی منافی ہے۔ یہ

عالمِ انسانیت کے باہمی تعاون، وفاشعاری و ہمدردی کا دائرہ نہایت محدود اور تنگ کر دیتا ہے اور انسانوں کے درمیان لامحدود تنازعات کا باعث بنتا ہے۔ مسئلہ قومیت پر اقبال کی تنقید اخلاقی، روحانی اور سیاسی حقائق پر مبنی ہے۔ وہ صداقتِ ادراک کے ساتھ یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ نظریہ انسانی زندگی سے اخلاقی اور روحانی قدروں کو معدوم و مفقود کر رہا ہے اور جو سیاست اخلاقی اقدار اور دیانت کی حد بندیوں سے متجاوز اور سرکش ہو جائے وہ بہیمیت کی حدود میں آجاتی ہے اور کبھی امن و آشتی کے خوش گوار ماحول کی طرف انسانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتی۔ اقبال کی چشمِ بصیرت نے یہ دیکھ لیا تھا کہ عصرِ حاضر کے انسانوں کے ذہن و ضمیر پر قومیت کا اتنا گہرا اثر ہے کہ دیوی دیوتا کی طرح اس کی ذہنی پرستش کی جانے لگی ہے اور مذہبی اقدار کے لیے بقا و فروغ کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں۔

مغربی تصورِ قومیت مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہونچا رہا تھا اسی لیے اقبال نے اسلامی دنیا کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے مؤثر جد وجہد کی۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا سیاسی رویہ نظری اور عملی دونوں اعتبار سے مغربی اقوام سے قطعاً جدا ہے اور اس کو ہمیشہ جدا ہی رہنا چاہیے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو حقائق سے باخبر کرتے ہوئے یہ تلقین کی کہ:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

فکر و نظر میں اس تبدیلی کے بعد اقبال ایک ہندوستانی قومیت پرست شاعر نہ رہے۔ بلکہ کاروانِ ملت کے حدی خواں بن گئے اور ان کا ترانۂ ملی اسی فکری و ذہنی اور نظریاتی انقلاب کی ترجمانی کرتا ہے:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا — اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال نے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ مغربی مفکرین کا پیش کردہ لادینی اور علاقائی تصورِ قومیت کوئی مفید، خوش گوار اور امن آفریں نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ تفریق و انتشار اور

نفرت و اختلاف پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ انھوں نے اہلِ اسلام کو آگاہ کیا کہ اگر یہ فلسفۂ قومیت ان کی سیاست و معاشرت میں جاگزیں ہو گیا تو انھیں دو خمیازوں میں سے ایک ضرور بھگتنا پڑے گا۔ یا تو یہ فلسفہ الحاد کا پیش خیمہ ثابت ہوگا یا اسلام محض دستورِ اخلاقیات بن کر رہ جائے گا اور اہلِ اسلام کی اجتماعی زندگی کے آئین کی حیثیت گم ہو جائے گی۔ نظریۂ قومیت اسلام کے اساسی اصولِ مساواتِ انسانی کے منافی ہے اس لیے اس کو ملتِ مسلمہ کی وحدت کی ممکن العمل بنیاد پر قطعاً مسترد کر دینا چاہیے۔ قرآن اور سنت کے مطابق وحدتِ ملت نظریاتی ہونی چاہیے، جس میں نسل، وطنیت اور قومیت کے یہ سب تصورات خلل انداز نہ ہو سکیں اور ایک ایسی برادری قائم ہو جائے جس کا رابطۂ اخوت محض ایمان اور اخلاقی نقطۂ نظر کی یک جہتی ہو۔

اقبال ملتِ اسلامیہ کے عالم گیر تصور پر ایمان رکھتے تھے اور جدید تصورِ قومیت کو عالمِ انسانی اور بالخصوص مسلمانوں کی ملی و دینی وحدت و اخوت کے لیے خطرناک سمجھتے اور اس مسئلہ کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے کہ اسلامی ہند کی تحریکِ آزادی کے نہایت نازک دور میں جب کانگریس کے ہم نوا جدید مغربی تصورِ قومیت کی تائید میں شدت سے پروپیگنڈہ کرنے لگے اور اپنے عہد کے ایک سرکردہ عالم مولانا حسین احمد مدنی نے، جو دارالعلوم دیوبند کے سربراہ بھی تھے اسلامی تصور کے برعکس مغربی تصورِ قومیت کی حمایت کی تو اقبال اس کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی شدید علالت کے باوجود انھوں نے ایک طویل بیان میں نہایت مدلل طور پر اس کی تردید کی اور ایک ایسا لافانی قطعہ تحریر کیا جو کانگریسی پروپیگنڈہ پر نہایت کاری ضرب ثابت ہوا:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است